ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

تکمیلِ انسانیت

صحیح فطرت کے لئے بیگانہ نصب العینوں اور خواہشات کی محبت سے نفس جتنا زیادہ آزاد ہوگا اتنا ہی یہ اپنے نصب العین حسن کے زیادہ قریب پہنچ سکے گا۔ حسن کے ہر تازہ علم کے ساتھ نفس نہ صرف خود آزاد ہوتا جاتا ہے بلکہ اپنے علم میں بھی اضافہ کرتا چلا جاتا ہے، یہ زیادہ سے زیادہ خود شعور ہوتا جاتا ہے اور مادی حجابات سے باہر نکلتا اور آہستہ آہستہ اپنے آپ پر قابو پاتا چلا جاتا ہے علم نفس اور علم حسن طریقۂ ارتقا کو لئے ہوئے ساتھ ساتھ بڑھتے ہیں حتیٰ کہ خود شعوری اُن انتہائی بلند منازل پر پہنچ جاتی ہے جہاں تک اس مادی دنیا کے اندر رہتے ہوئے نفس کے لئے پہنچنا ممکن ہوتا ہے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو انسانی شعور اپنے محبوب یعنی شعورِ ایزدی کے لئے ایک بے پناہ کشش محسوس کرتا ہے اور کچھ عرصہ تک تو اس طرح باہمی وصال محسوس کرتا ہے جس طرح کوئی سوئی کسی مقناطیس سے، جب سوئی مقناطیس کے کافی قریب آجائے تو وہ خود بخود سوئی کو اٹھا لے۔ جب تک نفس اس حالت میں رہتا ہے (اور یہ حالت بہت تھوڑی دیر تک قائم رہتی ہے) یہ اپنی آزادی سے غافل اور زمان و مکاں کی حدود سے ماورا ہو جاتا ہے کیونکہ اس وقت یہ زمان و مکاں کے خالق کے ساتھ مل کر ایک ہو چکا ہے۔ یہ تجربہ حیطۂ بیان سے باہر ہے ——— یہ نفس کے انتہائی ارتقا اور مکمل آزادی کا پتہ دیتا ہے، یہ انسان کے دائرہ علم کی عظیم ترین، انتہائی وجدآور اور نہایت مسرور کُن راحت ہے جس کے سامنے ہر قسم کی لذتیں اور راحتیں ہیچ ہیں۔ اس قسم کی لیکن اس سے کمتر درجے کی بتدریج بڑھنے والی خوشی کا تجربہ ارتقا پذیر نفس کو پہلے بھی ہو چکا ہوتا ہے اور اسی خوشی نے اُسے مزید جدوجہد پر ابھارا ہوتا ہے اور اس کی ہمت بندھائی ہوتی ہے۔ اب اس کا نقطۂ کمال آپہنچتا ہے۔ یہ خوشی اس قدر مسحور کُن ہوتی ہے کہ بعض دفعہ عاشق اس عالم کیف سے واپس نہیں آنا چاہتا۔ لیکن یہ جسارت محبوب کے سامنے گستاخی اور نافرمانی

ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ذہن چھن جاتا ہے، نفس مادی دُنیا سے منقطع ہو جاتا ہے کیونکہ وہ اس تعلق کو قائم رکھنا نہیں چاہتا۔ یہ سزا اس کی اپنی اختیار کردہ ہوتی ہے۔ ایک سچا عاشق نہ صرف یہ جانتا ہے کہ اس کا صحیح مقام ایک عبد (خادم) کا ہے بلکہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ محبت کی انتہائی نتیجہ خیزی صرف عبادت (خدمت) ہی کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہے۔ وہ اپنی ساری ہستی کے ساتھ جس میں اس کے قوائے عمل بھی شامل ہوتے ہیں، اپنا سر تسلیم محبوب کے سامنے خم کر دیتا ہے۔ وہ اس کے حضور میں اس نقطۂ نگاہ سے حاضر نہیں ہوتا کہ اپنے آپ کو فنا کر دے بلکہ اس لئے حاضر ہوتا ہے کہ اپنی منتشر قوتوں کو مجتمع کرے، اپنے آپ کا جائزہ لے اور عمل کے لئے اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لائے۔ وہ اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کیلئے اس پر تو تیار ہو جائے گا کہ محبوب سے دور رہے۔ لیکن اس بات کے لئے تیار نہیں ہو گا کہ وہ اس حد تک پہنچ جائے کہ اپنے آپ کو فنا کر دے۔ چنانچہ جب ارتقا کا نقطۂ عروج آ جاتا ہے تو وہ یہ محسوس نہیں کرتا کہ وہ محبوب کی آغوش میں چلا گیا ہے بلکہ یہ کہ محبوب اس کی آغوش میں آ گیا ہے۔ اس کے لئے آخری تجربہ فنائے ذات نہیں بلکہ تصدیق ذات ہے اور اسی سے نفس کی کامل آزادی برقرار رہ سکتی ہے۔ اپنی ترقی کے انتہائی مقام پر بھی وہ اس قسم کا احساس رکھ سکتا ہے کیونکہ وہ نہایت احتیاط سے اس کی حفاظت کرتا ہے۔ یہ احساس اس کے اس جذبۂ خدمت و عمل کی وجہ سے ہے جو اس کی خودشعوری کی ترقی کے دوران میں بلاشبہ نہایت بتدریج ہوئی تھی، غیر متغیر اور غیر متزلزل بن گیا تھا۔ اس نے اپنی اس ریاضت و بندگی کو کبھی مبدائے لذت نہیں سمجھا۔ یہ تو محض ایک ضمنی فائدہ ہے، بلکہ اسے قوت اعمال کا سرچشمہ سمجھتا ہے۔ یہی اس کی حقیقی خواہش و آرزو تھی۔ اس کا اصل مبدائے لذت خدمت و عمل تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی روز افزوں قوت سے رضائے محبوب حاصل کرنے کے لئے سرگرم عمل رہا تھا۔ لہٰذا اس کی تمام تر توجہ اس لذت کی طرف مبذول رہتی ہے جو اُسے محض صحبت سے حاصل ہوئی تھی۔ اس کے لئے عمل خود صحبت محبوب تھا۔ جب ایسا عاشق صادق ارتقائے نفس کے نقطۂ کمال پر پہنچ جاتا ہے تو وہ کبھی تغافل نفس کی حالت میں نہیں ہوتا بلکہ اس پر مکمل خودشعوری کی حالت طاری ہوتی ہے۔ بعض اوقات وہ اپنے خالق کی محبت میں اتنا ڈوب جاتا ہے کہ وہ یہ محسوس کرنے پر مجبور ہو

جاتا ہے گویا وہ خود خالق ہے۔ لیکن وہ اپنے آپ کو ایسا نہیں سمجھتا کیونکہ وہ خوب جانتا ہے کہ یہ احساس غلط ہے اور محض شدّت محبت کا نتیجہ ہے۔ اگر لوہے کا ایک ٹکڑا دیر تک آگ میں رکھا رہے تو وہ اتنا گرم اور سُرخ ہو جاتا ہے کہ اُسے آگ سے متمیز کرنا دشوار ہوتا ہے۔ اسی طرح شدّتِ محبت کے اوقات میں عاشق نفس اگرچہ اپنے آپ کو خالق کا مماثل قرار نہیں دیتا لیکن اس کے باوجود وہ خالق سے اپنے آپکو الگ سمجھنے میں دقت محسوس کرتا ہے۔ لیکن ایسے اوقات طویل نہیں ہوتے۔ عاشق ایک جانثار خادم کی طرح اپنی اصل حالت پر واپس آنا چاہتا ہے اور اس لئے جلد ہی لوٹ آتا ہے۔ اس صورت میں نفس اپنے علم کے سمندر میں گہرا غوطہ لگاتا ہے اور جب ابھر کر سطح سمندر پر آجاتا ہے تو فوراً اپنا اس طرح حاصل کردہ علم اسی مقصد یعنی خدمت محبوب کے لئے وقف کر دیتا ہے۔ حُسن و قوّت کے نشے سے سرشار ہو کر اس میں ایک متحرک اور فعال زندگی بسر کرنے کی آرزو پیدا ہو جاتی ہے جسے دیکھ کر تمام دُنیا حیران رہ جاتی ہے۔

عاشق صادق رضائے محبوب کو خدمت سے حاصل کرنے میں خوشی محسوس کرتا ہے یعنی اس کے نزدیک محبوب تک رسائی کی کوشش کرتے رہنا ـــــ واقعی اور بالآخر رسائی سے زیادہ راحت بخش ہے۔ عملاً رسائی کے احساس کا مطلب مزید رسائی اور مزید ترقی کا خاتمہ ہے حالانکہ عاشق کی ترقی اور رسائی کی انتہا نہیں۔ اس کی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ محبوب تک پہنچے بغیر اس کی جستجو جاری رہے۔ وہ جانتا ہے کہ اگر اسے عملاً رسائی حاصل ہو گئی تو اس کی مسرّت میں کمی واقع ہو جائے گی۔ اس لئے اس کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ محبوب سے دُور رہا جائے تاکہ وہ اس بے نظیر راحت و مسرّت سے ہمکنار رہے جو محبوب تک رسائی حاصل کرنے اور اس کی رضاجوئی کی جدوجہد میں مضمر ہے۔ وہ الگ رہنا چاہتا ہے تاکہ خدمت عمل کے نو بہ نو مواقع کی بدولت اپنی حاجات پر قابو پا کر رسائی کی کوشش ہمیشہ جاری رکھ سکے۔ اور جب تک دنیا اپنے منتہائے کمال کو نہیں پہنچ جاتی یا جب تک دوسرے نقوش انتہائی خُود شعوری کا مقام حاصل نہیں کر لیتے ایسے مواقع کی کبھی کمی رونما نہیں ہوگی۔

ایک عضویہ میں زندہ خلیہ دو حیثیتیں رکھتا ہے اوّلاً یہ اپنی حد تک ایک مکمل فرد اور ایک عضویہ

ہے اور اُسے اپنی صحت و بقا کی خاطر کام کرنا چاہیئے۔ ثانیاً یہ ایک ایسے کل کا جزو ہے جو عضویہ کل ہے۔ اس کی صحت اور عضویہ کی صحت لازم و ملزوم ہے۔ اگر یہ اپنی حد تک کافی صحت مند رہے ۔ تو یہ عضویہ کو بھی صحت بخشتا ہے اور اس طرح خود بھی صحت مند بنتا ہے۔ جب تک عضویۂ کل صحت مند نہ ہو یہ جزو مکمل طور پر صحت مند نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح ہر نفس انسانی کی دو حیثیتیں ہیں ——— یہ اپنی ذات کی حد تک مکمل فرد بھی ہے لیکن اُس کے ساتھ ہی ایک کل کا جزو بھی ہے جو آخر کار تمام انسانی معاشرے کا کل ہے۔ چنانچہ کوئی نفس انسانی انفرادی طور پر منتہائے کمال کو نہیں پہنچ سکتا بلکہ اس مقام پر صرف اسی کل کے ذریعے سے پہنچ سکتا ہے جس کا یہ ایک جزو ہے۔ چنانچہ عاشقِ شہید اپنے ذاتی کمالات پر مطمئن نہیں ہو جاتا۔ وہ اس وقت تک اپنے آپ سے غیر مطمئن رہتا ہے جب تک وہ اپنی تمام تر محبت و سعی کے مطابق نسلِ انسانی کے کل ارتقا میں مدد نہیں کرتا۔ باقی ماندہ انسانیت کے ارتقا کے لئے ہر کوشش جو وہ کرتا ہے، اسے اپنے داعیۂ شعور کو تھوڑا سا اور مطمئن کرنے اور انفرادی حیثیت سے خود شعوری کو مزید ترقی دینے کے قابل بنا دیتی ہے۔ یہ طریق کار لامتناہی عرصہ تک جاری رہ سکتا ہے۔ شعورِ انسانی کا داعیہ محض یہ نہیں کہ وہ اپنے کمال پر پہنچ جائے بلکہ اس کا داعیہ تمام انسانیت کو کمال تک پہنچانا ہے۔ کیونکہ شعورِ انسانی کا داعیہ وہی ہے جو شعورِ ایزدی کا ہے ظہور یا عرفانِ ایزدی کسی فردِ واحد میں کمالی یا منتہا حاصل نہیں کر سکتا۔ فردِ واحد نہیں بلکہ انسانی معاشرہ بحیثیت کل ہی خالق بن سکتا ہے۔ چنانچہ ایک سچا عاشق اس دنیا کو اپنے عمل سے اس طرح بدلتا ہے جس سے یہ اس کے محبوب اور اس کے اپنے مشترکہ مقصد کے لئے بیش از بیش موزوں بن سکے۔ اس کا عمل اس کے محبوب یعنی خالق کے عمل کی طرح تخلیقی ہے۔ کیونکہ یہ براہِ راست اور شعوری طور پر ارتقا کے لئے ممد اور مقصدِ تخلیق کے عین مطابق ہے۔ وہ زمین پر خالق کے نائب کی حیثیت سے اپنے فرائض سرانجام دیتا ہے۔ ایسا انسان ہی خالق کا حقیقی وصال حاصل کر سکتا ہے کیونکہ وہ اس طرح عمل کرتا ہے جس طرح خود خالق دنیا میں پیکرِ انسانی اختیار کر لینے کی صورت میں کرتا ۔۔۔ یہ خالق کا مقصد ہی ہے جو کسی شخصیت میں صورت پذیر ہوتا ہے اور دنیا میں سرگرمِ عمل رہتا ہے۔ ہم حضرت موسیٰؑ، بدھ، کرشن، حضرت عیسیٰؑ یا حضرت محمدؐ کی صورت میں کسی ایسی ہی شخصیت سے دوچار ہوتے ہیں۔ ایسا

شخص ایک مصلح کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے وہ جانتا ہے کہ اصلاح کی کس جگہ ضرورت ہے وہ ایک مبلغ کی شکل میں جہالت سے جنگ کر رہا ہوتا ہے یا ایک شہید کی شکل میں حق کی فتح کے لئے اپنے آپ کو قربان کر دیتا ہے یا ایک جرنیل کی شکل میں امن و انصاف کے لئے معرکہ آراء اور ظلم و عداوت کے خلاف شمشیر بکف ہوتا ہے یا بالعموم ایک معمولی دنیادار انسان کی شکل میں مذکورہ بالا ابطال سے کسی طرح کم نہیں ہوتا اور وہ دوسرے انسانوں کے سامنے مشکلات میں صبر و عزیمت کے راستے پر چل کر ایک عمدہ مثال قائم کرتا ہے۔ لیکن ایسے ابطال کو جو خالق کائنات کی محبت سے حرارت حاصل کرتے ہیں۔ ان مشاہیر سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیئے جو غلط نصب العینوں کی محبت و خدمت میں اپنی شخصیت کی نمود کرتے ہیں۔ کیونکہ ایسے لوگوں کی قربانیاں صرف نصب العین کے لئے ہوتی ہیں اور انسانیت کے لئے یہ بلا واسطہ مفید اشیاء کے مترادف ہوتی ہیں۔

محبت فرد کی تمام زندگی کو بدل دیتی ہے۔ عاشق اپنے آپ کو حقیقی اور ناقابل فنا سمجھتا اس کا سینہ امید، ہمت اور اعتماد سے معمور ہوتا ہے اور وہ دنیا میں نہایت سکون و اطمینان سے رہتا ہے۔ صرف اسی میں ایک بلند شخصیت یا صحیح طور پر اچھا کردار مل سکتا ہے۔ وہ صفات خالق کے رنگ میں گہرا رنگا ہوا ہوتا ہے۔ وہ تمام نوع انسانی کے لئے رنگ، نسل اور قوم کی تمیز کے بغیر مہربان اور فیاض ہوتا ہے۔ وہ صادق القول، ایماندار، بہادر، رحم دل، مضبوط، آزاد خوددار، شائستہ، ملنسار، عالی ہمت اور بردبار ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ خوف، جو تمام برائیوں کی جڑ ہے، اس کے پاس نہیں پھٹکتا۔ خوف کا کیا سبب ہے؟ ہم اس لئے خوف کھاتے ہیں کہ مبادا ہم جو کچھ چاہتے ہیں، حاصل نہ کر سکیں۔ جب ہم پر خوف کا غلبہ ہوتا ہے تو ہم جھوٹ، مکر، فریب، مصلحت، دغا، کینہ، خوشامد، چوری، قتل، بزدلی اور ظلم پر اتر آتے ہیں۔ عاشق کو صرف رضائے محبوب چاہیئے اس لئے اسے کسی شے سے خوف کی ضرورت نہیں۔ دوسرے انسانوں کی طرح وہ بھی دنیا کی اچھی چیزوں سے اچھے طور پر متمتع ہونا چاہتا ہے ـــــ یعنی ایسے ذرائع سے جو رضائے محبوب کے مطابق ہوں، ورنہ وہ انہیں سرے سے حاصل ہی نہیں کرتا۔ صرف وہی جانتا ہے کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے۔ اسے اعتماد ہوتا ہے کہ کوششوں میں کمی کے بغیر وہ اس شے کو حاصل

کرتا رہے گا جو رضائے محبوب کے مطابق ہے، اور جس سے زیادہ اسے کوئی شے مطلوب نہیں محبوب کی رضا اس کی اپنی رضا ہوتی ہے چنانچہ اسے کسی شے سے خوف نہیں ہوتا سوائے خود خوف اور اس کی انجام کار برائیوں سے۔ اس کی محبت رضائے محبوب ہے اور یہ شے اسے ہر دوسری محبت سے نجات دے دیتی ہے۔ یہی صحیح معنوں میں آزادی نفس ہے اور صرف یہی کردار کو پاکیزہ بنا سکتی ہے اور فرد کی شخصیت کو ترفع سے آشنا کر سکتی ہے۔

بقیہ اداریہ

یہ قرآن حکیم سے ماخوذ ہے علامہ اقبالؒ کی عظمت کا اسمیں مضمر ہے کہ آپنے اس ۰۰ زہن قرآنی تعلیمات کو سمجھنے میں غیر معمولی ذہانت فراست کا ثبوت دیا اور مغربی افکار کو قرآن کی کسوٹی پہ پرکھا اور جانچا۔ انمیں اگر کوئی بات اسلام کیموافق میں پائی تو اسکی نشاندھی کی اور جہاں کوئی بات اسلام کے خلاف پائی اس کا رد کیا۔ اب اس کا کیا علاج کہ دورِ حاضر کے اقبالئین علامہ اقبالؒ کے منابع فکر کو مغربی افکار میں تلاش کرنے کو ہی علمی کمال قرار دیتے ہیں۔ اس علمی گمراہی کے خلاف اقبالؒ کی مدافعت میں اسلامی تعلیم کے صفحات اُن تمام اصحاب کیلئے حاضر ہیں جو فکرِ اقبالؒ کے منابع کو قرآن اور اسلام کے فکری سرمایہ میں تلاش کریں۔

سید جمال الدین افغانیؒ مشاہیر اسلام میں اس اعتبار سے منفرد حیثیت رکھتے ہیں کہ آپنے ماضی قریب میں مسلمانانِ عالم کو ایک مرکز پہ جمع کرنیکی قابلِ قدر مساعی کیں اور اس کیلئے آپنے ایک ایسا عملی خاکہ تجویز فرمایا جو ہر لحاظ سے مکمل تھا حافظ عباد اللہ فاروقی صاحب نے سید صاحب کی زندگی کے واقعات کو نہائت سادہ پیرائے اور دلنشین انداز میں پیش کیا ہے آپکا یہ تجزیہ کسقدر صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یورپ بلکہ مغرب کی موجودہ سیاست سیّد جمال الدینؒ افغانی کی سیاست کا ردِ عمل ہے مسلمانوں کو داخلی اور خارجی سطح پہ ایکدوسرے سے لڑا جا رہا ہے اور ایسی صورتحال پیدا کر دی گئی ہے کہ وہ کبھی آپسمیں متحد نہ ہونے پائیں۔

یزیدی المیوں کا پس منظر میں محمد یوسف صاحب نے اسلامی تاریخ کے ایک انتہائی اندوہناک باب پہ قلم اُٹھایا ہے جس کے تلخ اثرات آج بھی ہماری قومی زندگی میں زہر گھولے ہوئے ہیں اس ضمن میں فاضل مضمون نگار نے چند نہائت سنسنی خیز انکشافات کئے ہیں جن پہ مزید تحقیق و تفتیش کی ضرورت ہے مضمون کے مطالعہ سے ایک تلخ حقیقت جو سامنے آتی ہے یہ ہے کہ مسلمان قوم کی کس قدر بدبختی ہے کہ فرقہ آرائی میں ایک دوسرے کے خلاف کدورتیں پالنے کی روش کو چھوڑ کر اپنی تاریخ کے اندر اُس حقیقی دشمن کو نہیں پاتے جو مسلمانوں کی بدنصیبیوں کا اصل سبب رہا ہے اور آج بھی ہماری گھات میں ہے۔ ہمارا یہ خیال ہے کہ اس چھپے ہوئے دشمن کی نشاندہی کرنے سے ہی ہمارے باہمی اختلافات رفع ہو سکتے ہیں۔ کاش! ہمارے مورخین اس اہم کام کی طرف توجہ دے سکیں۔ (مدیر)